درس ۲۶

اُمت مسلمہ سے خطاب کے ضمن میں
قرآنِ حکیم کی جامع ترین سورت
اُمُّ المُسَبِّحات : سورۃ الحدید
(۹)

نحمدہٗ ونصلی علٰی رسولہ الکریم ...... امّا بعد:

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿ یَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۞ يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَاۗءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ۭ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ۭ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ۞ يُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ حَتّٰى جَاۗءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۞ ﴾ (آیات ۱۲ تا ۱۴) ...... صدق اللہ العظیم

سابقہ مباحث کا اعادہ

تفہیم کے لئے سورۃ الحدید کو سات حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ جو ۶ آیات (۱ تا ۶) پر مشتمل ہے' میرے اندازے میں یہ ذات وصفاتِ باری تعالیٰ پر قرآن حکیم کا جامع ترین اور اہم ترین مقام ہے۔ دوسرا حصہ پانچ آیات (۷ تا ۱۱) پر مشتمل ہے۔ ان میں سے پہلی آیت (آیت ۷) میں دین کے کل تقاضوں کو دو

© rasailojarai
© rasailojarai

اصطلاحات (ایمان اور انفاق) میں بیان کر دیا گیا ہے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا﴾ ''ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول (ﷺ) پر اور خرچ کرو (اللہ کی راہ میں)''۔ پھر آیت ۸ اور ۱۰ میں ذرا زجر کے انداز میں فرمایا گیا ہے کہ کیوں ایمان نہیں رکھتے؟ اور یہ کہ کیوں خرچ نہیں کرتے اللہ کی راہ میں؟ جبکہ آیت ۹ اور آیت ۱۱ میں ترغیب وتشویق، حوصلہ افزائی اور ابھارنے کا انداز ہے کہ نیکی کے کاموں میں آگے بڑھو، اگر اپنے گریبانوں میں جھانکو اور محسوس کرو کہ وہ یقین والا ایمان نہیں ہے تب بھی مایوس ہونے کی بات نہیں، تمہارے لئے قرآن کریم کی آیاتِ بینات موجود ہیں، ان سے تم اپنے تمام باطنی اندھیروں کو زائل کر کے اپنے باطن کو نورِ ایمان سے منور کر سکتے ہو۔ اس سلسلے کی آخری آیت (آیت ۱۱) میں فرمایا: ﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ ''کون ہے وہ جو قرض دے اللہ کو قرضِ حسنہ؟'' اس میں ایک طرح سے غیرتِ ایمانی کو بھی للکارا گیا ہے کہ ہمت کرو! ایمان و یقین کا تقاضا ہے کہ اللہ کی راہ میں سب کچھ لگا دو اور کھپا دو۔

اس آیت سے متعلق ایک واقعہ ہے جو کہ ماقبل درس میں بیان ہونے سے رہ گیا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب قرآن پڑھتے یا سنتے تھے تو ان کا تاثر کیا ہوتا تھا! ان کے دلوں میں فوری طور پر عمل کے لئے آمادگی پیدا ہوتی تھی۔ چنانچہ جب یہ آیت نازل ہوئی اور حضور اکرم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سنائی تو حضرت ابوالدحداح انصاری رضی اللہ عنہ نے فوراً اس پکار پر لبیک کہا۔ ان کا مدینے میں سب سے بڑا باغ تھا جس میں کھجور کے چھ سو درخت تھے۔ باغ میں چشمہ بھی تھا۔ اسی میں ان کا رہائشی مکان بھی تھا۔ ایک انسان کا دنیا میں آسائشوں کا یہی تصور ہو سکتا ہے نا کہ گھر کے ساتھ خوبصورت باغ ہو، گھنیری چھاؤں ہو، چشمہ ہو، وغیرہ۔ تو انؓ کے پاس بھی گویا یہ ساری سہولتیں تھیں۔ انہوں نے فوراً سوال کیا کہ حضورؐ! کیا اللہ ہم سے قرض مانگ رہا ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا: ''ہاں''۔ تو حضرت ابوالدحداح رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: تو ہاتھ بڑھائیے! حضورؐ نے اپنا دست مبارک بڑھایا تو اپنا ہاتھ حضور ﷺ کے

© rasailojaraid.com

ہاتھ میں دیتے ہوئے عرض کیا: میں نے اپنا باغ اللہ کو قرض دے دیا ہے۔ اس کے بعد وہاں سے خوشیاں مناتے ہوئے اپنے گھر کی طرف لوٹے۔ یہاں یہ بھی نوٹ کیجئے کہ بعض اوقات انسان جذباتی طور پر کوئی کام کر گزرتا ہے' کوئی بہت بڑی چھلانگ لگا تو لیتا ہے لیکن پھر فوراً ایک ردعمل بھی ہوتا ہے کہ یہ میں کیا کر بیٹھا! لیکن حضرت ابوالدحداح رضی اللہ عنہ نے اسے بڑی کامیابی سمجھا اور مسرور ہو کر واپس گھر گئے۔ اب باغ میں داخل بھی نہیں ہوئے' یہ سوچ کر کہ اب یہ اللہ کا ہو چکا ہے' باغ کی فصیل کے باہر سے ہی پکارا: اے امّ الدحداح! یہاں سے نکل آؤ' میں نے یہ باغ اللہ کو دے دیا ہے! اور وہ بھی اللہ کی بندی وہاں سے اپنا ذاتی سامان لے کر یہ کہتی ہوئی نکل آئی کہ یہ تم نے بہت عمدہ سودا کیا ہے۔ دراصل یہی انداز تھا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا جس کی وجہ سے کل بیس برس میں ''مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ'' کے ہاتھوں تاریخ انسانی کا عظیم ترین انقلاب برپا ہو گیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں عمل کے لئے دلی آمادگی اس قدر تھی کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جو حکم بھی آتا اس پر عمل کے لئے فوراً تیار ہو جاتے۔ ظاہر ہے دلوں میں ایمان پہلے سے موجود ہے تو عمل میں تاخیر کیسی!

اس سورۂ مبارکہ کا تیسرا حصہ چار آیات پر مشتمل ہے' اور جس طرح پہلے حصے میں بڑی اہم آیت تھی: ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ﴾ بالکل اسی مقام و مرتبہ کی حامل آیت اس حصے میں بھی ہے' جو دراصل منافقت کی حقیقت کو واضح کرنے کے لئے ہے۔ ہم یہ بات جان چکے ہیں کہ آخرت میں ایک چھلنی تو کھلم کھلا کافروں اور مسلمان ہونے کے دعوے داروں کے مابین لگے گی جو انہیں علیحدہ علیحدہ کر دے گی۔ اس کے بعد مسلمان سمجھے جانے والوں کے مابین ایک چھلنی لگے گی' یہ چھان پھٹک کرنے کے لئے کہ ان میں کون واقعی مؤمن تھا اور کون جھوٹ موٹ کا مؤمن بنا ہوا تھا۔ یعنی جھوٹے اور سچے کے مابین ایک تمیز ہو جائے گی۔ یہ ایک مرحلہ ہے جسے ہم عام طور پر اپنے محاورے میں ''پل صراط'' کہتے ہیں۔ اس پل صراط کا تصور یہاں بھی موجود ہے اور مدنی سورتوں کے اس سلسلہ کی آخری سورۃ' سورۃ التحریم میں بھی بعینہٖ انہی الفاظ

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ مضمون کے اعتبار سے سورۂ مریم میں بھی اس کا تذکرہ موجود ہے۔ وہاں فرمایا گیا: ﴿وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ۞ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ۞﴾ (آیات ۷۱، ۷۲)

''اور تم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو اس (جہنم) پر وارد نہ ہو۔ یہ تو ایک طے شدہ بات ہے جسے پورا کرنا تیرے ربّ کے ذمہ ہے۔ پھر ہم ان لوگوں کو بچا لیں گے جو (دنیا میں) متقی تھے اور ظالموں کو اس میں گرا ہوا چھوڑ دیں گے''۔ یعنی چاہے مؤمن ہو' کافر ہو' مسلم ہو' منافق ہو' سب کو ایک بار پل صراط پر سے گزارا جائے گا۔ مفسرین نے اس کی یہ حکمت بیان کی ہے کہ اہل ایمان کو بھی اندازہ ہو جائے کہ اللہ نے انہیں کس خطرناک شے سے بچایا ہے' ورنہ شاید انہیں اندازہ نہ ہو سکے کہ یہ کتنی بڑی کامیابی ہے اور ان پر اللہ کا کتنا بڑا فضل ہوا ہے۔

پل صراط پر سے گزرنا کس طرح کا ہو گا' اس کی حقیقت تو وہیں جا کر کھلے گی۔ میدانِ حشر کی کیفیات کو ہم صرف اُن کے قریب ترین الفاظ میں ہی بیان کر سکتے ہیں جو قرآن مجید میں آئے ہیں' ان کی اصل حقیقت ہمیں یہاں نہیں معلوم ہو سکتی۔ بہرحال وہ کوئی ایسا مرحلہ ہو گا کہ شدید گھپ اندھیرا ہو گا' وہاں اہل ایمان کے دلوں میں موجود ایمان اور ان کے اعمالِ صالحہ کے نور کا ظہور ہو جائے گا جو وہ دنیا سے لے کر گئے ہوں گے۔ ان کا نورِ ایمان ان کے سامنے اور اعمالِ صالحہ کا نور اُن کی داہنی طرف ہو گا۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے: ﴿يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ﴾ ''جس دن کہ تم دیکھو گے مؤمن مَردوں اور مؤمن عورتوں کو' کہ دوڑتا ہوا ہو گا ان کا نور ان کے سامنے اور ان کی داہنی طرف''۔ یعنی وہ خود چل رہے ہوں گے اور ان کا نور ان کے دائیں اور سامنے کی طرف چل رہا ہو گا۔ علامہ ابن جریر طبری کی تفسیر میں حضور ﷺ کا اس بارے میں جو قول نقل ہوا ہے وہ میں آپ کو سنا چکا ہوں کہ ''کسی کو جو نور ملے گا وہ اتنا ہو گا کہ اس کی روشنی مدینے سے صنعاء تک جائے گی۔ اور کسی کو بس اتنا نور ملے گا کہ اس کے قدموں کے آگے روشنی ہو جائے گی''۔ اور اس دن

© rasailojarai
© rasailojarai

وہ شخص بھی بہت خوش نصیب ہوگا جس کے بس قدموں کے سامنے روشنی ہو جائے گی۔

بہرحال اہلِ ایمان اپنے اس نورِ ایمان اور نورِ اعمالِ صالحہ کی روشنی میں اس راستے سے گزر جائیں گے۔ ان سے کہا جائے گا: ﴿بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۞﴾ ''بشارت ہے تمہارے لئے آج کے دن اُن باغات کی جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہیں' اور ان میں تمہیں اب ہمیشہ ہمیش رہنا ہے' یہی ہے اصل اور بڑی کامیابی۔''

اس کے برعکس کیفیت کیا ہوگی' فرمایا: ﴿يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ﴾ ''اس روز منافق مردوں اور عورتوں کا حال یہ ہوگا کہ وہ مومنوں سے کہیں گے کہ ذرا ہمارا انتظار کرو (ہمیں مہلت دو)' تاکہ ہم تمہارے نور سے کچھ فائدہ اٹھائیں''۔ یہ منافقین کا تذکرہ ہو رہا ہے جو ایمان سے تہی دست تھے مگر دنیا میں مسلمان سمجھے جاتے تھے۔ اس سورۂ مبارکہ کی یہ تین آیات (۱۳' ۱۴ اور ۱۵) نفاق کے موضوع پر قرآن مجید کا اہم ترین مقام ہے۔ درحقیقت سورۃ الحدید' جسے اُمُّ المُسبّحات کہا جاتا ہے' اس میں سلسلۂ مُسبّحات کی بقیہ نو مدنی سورتوں کے مضامین کا خلاصہ اور جامع انڈکس موجود ہے۔ گیارہ آیات پر مشتمل سورۃ المنافقون پوری کی پوری اسی نفاق کے موضوع پر ہے اور اس کی پہلی آٹھ آیات میں جو کچھ بیان ہوا ہے سورۃ الحدید کی ان تین آیات میں گویا اس کی مزید تشریح ہے۔

نفاق کی حقیقت اور مراحل و مدارج

''نِفَاق'' کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے نوٹ کیجئے کہ لفظ 'نِفَاق' اور 'اِنفاق' کا مادہ ایک ہی ہے' یعنی ''ن' ف' ق''۔ نَفَقَ' یَنْفُقُ سے اِفعال کے وزن پر لفظ 'اِنفاق' بنا ہے جس کے معنی ہیں ختم ہو جانا' خرچ ہو جانا۔ جیسے کہا جاتا ہے: نَفَقَ الْفَرَسُ ''گھوڑا مر گیا'' یا ''گھوڑا کام آ گیا''۔ اور نَفَقَتِ الدَّرَاهِمُ ''پیسے ختم ہو گئے!'' یہاں اس انفاق کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے' بایں الفاظ: ﴿اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ﴾ اور اسی مادے سے بابِ مُفاعلہ میں ''منافقت'' بنا ہے۔ ''نَفَقٌ''

© rasailojaraid.c
© rasailojaraid.c

سے مراد ہے زیر زمین راستہ یا سرنگ جس کے دو مُنہ ہوتے ہیں۔ پچھلے زمانے میں بادشاہ عام طور پر ایسے فوجی قلعے بنواتے تھے کہ ان میں محل بھی ہوتے تھے اور شکست کی صورت میں اپنی جان بچانے کے لئے قلعے میں ایسی خفیہ سرنگیں بنائی جاتی تھیں جو دُور کسی جنگل میں جا کر نکلتی تھیں، تاکہ دشمن اگر صدر دروازے سے داخل ہو ہی جائے تو وہ اس سرنگ کے ذریعے سے گھوڑے دوڑاتے ہوئے فرار ہو سکیں۔ لہٰذا بچاؤ کے لئے یہ سرنگیں بنائی جاتی تھیں۔ اسی طرح گوہ جو ایک صحرائی جانور ہے، اس میں اللہ نے اتنی عقل رکھی ہے کہ وہ اپنے لئے زیر زمین جو بھٹ یا بل بناتا ہے اس کے دو مُنہ رکھتا ہے، تاکہ اگر ایک راستے سے شکاری کتے داخل ہوں تو وہ دوسرے راستے سے نکل کر اپنی جان بچا سکے۔ اس لئے کہ صحرائی لوگ اس کا شکار کر کے اس کا گوشت کھاتے تھے۔ گوہ کے بل کو نافقاء کہتے ہیں۔ اسی ''نفق'' سے لفظ ''منافقت'' بنا ہے۔ تو منافقت کی اصل حقیقت یہی ہے کہ اپنے آپ کو بچا کر رکھنا۔ ایک تو صادق الایمان ہوتے ہیں جن کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ وہ سب کچھ کھپا دینے میں ہی اپنی کامیابی سمجھتے ہیں۔ جیسے اقبال نے کہا۔

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئنہ ہے وہ آئنہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئنہ ساز میں!

لیکن منافقین کا رویہ اس کے برعکس ہوتا ہے کہ بچ بچ کر چلو، جان اور مال کو بھی بچاؤ اور مسلمانوں کے ساتھ بھی چلو۔ بظاہر ایمان لے آنا ان کی مجبوری بن جاتا ہے، کیونکہ اگر سارا قبیلہ ایمان لے آیا ہے تو ان کا بھی ایمان لے آنا معاشرتی دباؤ کی بنا پر لازمی ہو جاتا ہے، ورنہ تو انہیں اپنے قبیلے سے کٹنا پڑتا ہے۔ تو وہ مسلمانوں میں تو شامل ہو جاتے ہیں مگر اپنے آپ کو بچا بچا کر چلتے ہیں۔ تو یہ اپنے آپ کو بچانا دراصل نفاق کی بنیاد ہے۔

اب جب اللہ کی راہ میں مال و جان کے ساتھ جہاد کا حکم ہوتا ہے تو مؤمنین صادقین کی روش یہ ہوتی ہے کہ وہ لبیک کہتے ہوئے حاضر ہو جاتے ہیں، لیکن منافقین اس سے گریز کی راہ اختیار کرتے ہیں اور جھوٹے بہانے بناتے ہیں۔ یہاں نوٹ کیجیے

© rasailojaraid
© rasailojaraid
© rasailojaraid

کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہو سکتے ہیں جنہوں نے حیلے بہانے سے اپنے آپ کو اس کٹھن صورت حال سے بچا تو لیا ہو' لیکن بعد میں اپنی غلطی اور کوتاہی کا اعتراف کرتے ہوئے حضور ﷺ کے سامنے معذرت پیش کی ہو' تو اس کو نفاق نہیں کہیں گے' بلکہ یہ صرف ضعف ایمان ہے۔ لیکن جب ان بہانوں میں جھوٹ کا عنصر بھی شامل ہو گیا' جھوٹے بہانے بنانے شروع کر دیئے تو یہ نفاق کی پہلی سٹیج ہے۔ پھر ایک عرصہ گزرنے کے بعد جب انسان سوچتا ہے کہ اس کا تو اعتبار ہی ختم ہو گیا ہے تو اب وہ جھوٹی قسمیں کھاتا ہے اور یہ نفاق کا دوسرا درجہ ہے۔ اور تیسرا درجہ وہ ہے جب مؤمنین صادقین سے کد ہو جاتی ہے' ان سے بغض ہو جاتا ہے کہ یہ تو پاگل اور جنونی لوگ ہیں جو نہ دائیں دیکھتے ہیں نہ بائیں دیکھتے ہیں' نہ انہیں آگے کی فکر ہے' نہ پیچھے کی فکر ہے' کوئی مصلحتیں دیکھتے ہی نہیں۔ اب ان کا قول یہ ہوتا ہے: ﴿اَنُؤۡمِنُ كَمَاۤ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ﴾ ''کیا ہم اس طرح ایمان لے آئیں جیسے یہ بے وقوف ایمان لائے ہیں؟'' یہ تو جنونی ہیں' یہ fanatics ہیں۔ تو جب مؤمنین صادقین سے دشمنی ہو گئی تو یہ نفاق کی تیسری سٹیج ہے۔ یہ نفاق دراصل انسان کی باطنی کیفیت ہے جو مختلف مراحل سے گزر کر انتہائی سٹیج کو پہنچتی ہے۔ یہاں اس کو بہت عمدگی کے ساتھ واضح کیا گیا ہے۔

نفاق کے بارے میں ایک مغالطے کا ازالہ

ایک بات اور نوٹ کر لیجئے کہ دورِ نبوی ﷺ میں شعوری نفاق بہت شاذ اور کم تھا۔ عام مغالطہ یہ ہے کہ منافق وہی ہوتا ہے جو جان بوجھ کر منافق بنا ہوا ہو' جبکہ درحقیقت یہ بات نہیں تھی۔ منافقین کی اکثریت وہ تھی جو ایمان تو خلوص کے ساتھ لائے تھے' لیکن ایمان کے تقاضے پورے کرنے کے لئے جو ہمت درکار ہوتی ہے ان میں اس کا فقدان تھا۔ گویا ع ''ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم'' والی کیفیت نہیں تھی۔ جس شخص میں ایمان کی پختگی اور گہرائی اتنی نہیں ہوتی کہ وہ اپنا سب کچھ اللہ کی راہ میں لگانے کے لئے تیار ہو جائے تو وہ ایک طرح کی پسپائی اختیار کرتا ہے اور ارتدادِ معنوی کا شکار ہو جاتا ہے اور اندر ہی اندر پیچھے ہٹنا شروع کرتا ہے۔ درحقیقت اسے یہ خیال

© rasailojaraid.
© rasailojaraid.

نہیں ہوتا کہ میں منافق ہو گیا ہوں' بلکہ وہ سوچتا ہے کہ ان (سچے اہل ایمان) کو کیا ہو گیا ہے' خواہ مخواہ یہ لوگ جنگ کے لئے تیار ہو جاتے ہیں' آخر صلح سے بھی تو کام چل سکتا ہے اور دشمن کو گڑ دے کر بھی تو مارا جا سکتا ہے' جبکہ یہ لوگ ہر وقت جنگ ہی کی فکر رکھتے ہیں۔ غزوۂ بدر کے موقع پر ان کا موقف تھا کہ جب اللہ نے فرما دیا ہے کہ دو میں سے ایک پر تمہیں ضرور فتح مل جائے گی تو قریش کے قافلے کی طرف کیوں نہیں چلتے جہاں بہت سا مال و دولت ہے اور ان پچاس آدمیوں کے ہتھیار بھی ہمیں مل جائیں گے۔ مصلحت کا تقاضا تو یہ ہے کہ پہلے اُدھر جائیں! تو اصل میں وہ لوگ یہ نہیں سمجھ رہے ہوتے کہ ہم جھوٹے ہیں' یا ہم دھوکہ دے رہے ہیں' بلکہ یہ اصل میں مسلمانوں کے اندر ہی گھٹے ہوتے ہیں۔ چنانچہ سورۃ المنافقون ہی میں فرمایا گیا ہے: ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا﴾ "یہ اس لئے ہوا کہ یہ ایمان لائے' پھر کفر میں چلے گئے"۔ یعنی یہ ایمان تو لائے تھے خلوص کے ساتھ' نہ کہ دھوکہ دینے کے لئے' لیکن پھر رفتہ رفتہ ارتدادِ معنوی کا شکار ہو گئے اور پسپا ہوتے ہوتے کفر تک چلے گئے۔ یعنی ان کا یہ ارتداد اندر ہی اندر ہوتا ہے۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ انہیں ایک قانونی تحفظ تو حاصل رہتا ہے۔ جیسے دیمک کسی چوکھٹ یا شہتیر کو اندر سے تو چٹ کر چکی ہوتی ہے لیکن اوپر ایک تہہ چھوڑ دیتی ہے تاکہ دیکھنے والوں کو پتہ نہ چل جائے کہ اندر اس چوکھٹ یا شہتیر کے ساتھ کیا قیامت گزر رہی ہے۔ تو نفاق بھی دراصل یہی ہے جو باطن میں شروع ہوتا ہے۔

اس اعتبار سے اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ عام معنی میں گناہگار اور اس قسم کے غیر شعوری منافق میں بس تعبیر کا فرق ہے۔ گناہگار بھی تو یہی ہوتا ہے جو جانتا ہے کہ یہ شے اللہ نے حرام کی ہے' پھر بھی اس کا ارتکاب کر رہا ہوتا ہے۔ تو اس وقت وہ بھی ایمان سے تہی ہوتا ہے! اس اعتبار سے جان لینا چاہئے کہ گناہگار اور ایسے منافق میں حقیقت کے اعتبار سے باریک سا پردہ ہے۔ یہ بات میں نے اس لئے بیان کی ہے کہ اس آیت میں ایک خاص اور اہم نکتہ ہے جو اِس کے بغیر سمجھ میں نہیں آ سکتا۔

اب آگے چلئے! جب اہل ایمان آگے نکل جائیں گے تو یہ منافق مرد اور عورتیں

© rasailojaraid
© rasailojaraid
© rasailojaraid

ان سے کہیں گے: ﴿ انظُرُونَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّورِكُمْ ﴾ کہ ذرا ہمیں مہلت دو' ہمارا انتظار کرو' تاکہ ہم تمہارے نور سے استفادہ کرلیں' کچھ اقتباس کرلیں۔ ہم بھی اس سے فائدہ اٹھا کر پل صراط پر سے گزر جائیں۔ ﴿ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ﴾ ''کہا جائے گا کہ اپنے پیچھے کی طرف لوٹ جاؤ اور نور تلاش کرو''۔ یعنی اگر تمہارے لئے ممکن ہے تو پیچھے دنیا کی طرف لوٹ جاؤ اور نور تلاش کر کے لے آؤ! اس لئے کہ یہ نور یہاں نہیں دیا گیا' بلکہ یہ دنیا کی زندگی میں کما کر ساتھ لایا گیا ہے۔ دنیا میں ایمان کا بھی کسب کرنا ہوتا ہے اور اعمالِ صالحہ تو ہیں ہی سراسر کسب۔ تو اگر تمہارے لئے بھی ممکن ہو تو لوٹ جاؤ پیچھے کی طرف اور یہ نور تلاش کرنے کی کوشش کرو۔

اہل سنت کے ایک عقیدے کی قرآنی بنیاد

آگے فرمایا: ﴿ فَضُرِبَ بَيْنَهُم بِسُوْرٍ لَّهُ بَابٌ ﴾ ''پھر ان کے مابین ایک فصیل حائل کر دی جائے گی' جس میں ایک دروازہ ہوگا''۔ یہ فصیل تو درحقیقت ایک فصل قائم کرنے کے لئے ہوگی۔ اہل ایمان آگے نکل گئے ہوں گے اور اِدھر یہ منافق پیچھے سے پکارتے ہی رہ جائیں گے۔ تو ان کے درمیان فاصلہ تو پہلے سے ہو گیا ہوگا' اب ان کے درمیان فصیل بھی حائل کر دی جائے گی۔ ﴿ بَاطِنُهُ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهُ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ﴾ ''اس کے اندر کی طرف رحمت ہوگی اور اس کے باہر عذاب ہوگا''۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ بَاطِنُهُ اور ظَاهِرُهُ کی ضمیر کا مرجع کیا ہے؟ بہت سے حضرات نے اس سے دروازہ مراد لیا ہے کہ اس دروازے کے اندر کی جانب اللہ کی رحمت کا نزول اور اس کے باہر کی جانب عذابِ خداوندی کا ظہور شروع ہو جائے گا۔ لیکن مجھے اس نقطۂ نظر میں کافی تامل تھا۔ اس مقام پر غور و فکر کے نتیجے میں میری جو رائے بنی ہے اس کی تائید مجھے امام رازی سے مل گئی ہے کہ اس ضمیر کی نسبت دروازے کی طرف نہیں ہے' بلکہ سُوْر (فصیل) کی طرف ہے۔ (واللہ اعلم!) یعنی اس فصیل کے اندر کی طرف اللہ کی رحمت ہوگی اور اس فصیل کے باہر کی طرف اللہ کا عذاب ہوگا۔

اس مقام پر ایک خیال سا آتا ہے کہ اس فصیل میں دروازے کی کیا ضرورت ہو

© rasailojarar

گی؟ لیکن آج مجھے اس پر انشراح ہوا ہے کہ یہاں دروازے کا تذکرہ کیوں ہے۔ یہ درحقیقت ہمارے اہل سنت کے ایک مجمع علیہ عقیدے کے لئے بنیاد ہے' جس کے لئے قرآن مجید میں اس کے علاوہ کہیں اور ذکر نہیں ہے۔ اہل سنت کا مجمع علیہ عقیدہ ہے کہ جس شخص کے دل میں ایمان کی کچھ رمق بھی ہوگی وہ اپنے گناہوں کی سزا پا کر بالآخر جہنم سے نکال لیا جائے گا۔ جہنم میں خُلود صرف ان کے لئے ہے جن کے دلوں میں سرے سے ایمان کی کوئی رمق نہیں ہوگی۔

جن غیر شعوری منافقین کا میں نے تذکرہ کیا ہے ان کے اور عام گناہگاروں کے مابین درحقیقت صرف ایک تعبیر کا فرق ہے' ورنہ جو تضاد اُن کی زندگیوں میں ہے وہی تضاد اِن کی زندگیوں میں بھی ہے۔ اس بارے میں مَیں سائیں عبدالرزاق صاحب کا یہ قول سنایا کرتا ہوں: ''جو دم غافل سو دم کافر!'' اور ارشادِ الٰہی ہے: ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۞﴾ ''اور جس نے اس کے مطابق فیصلہ نہ کیا جو اللہ نے نازل کیا ہے تو وہی تو کافر ہیں''۔ ہماری عدالتوں میں ہر روز نہ معلوم کتنے فیصلے قرآن وسنت کے خلاف ہو رہے ہیں۔ پورے ملک اور پوری اُمت مسلمہ کی سطح پر جو فیصلے ہو رہے ہیں وہ سب کے سب اللہ کی شریعت کے خلاف ہو رہے ہیں۔ قرآن کے فتوے کے مطابق تو ہم سب کے سب کافر ہیں۔ لہٰذا غیر شعوری منافق اور گناہگار میں کوئی فرق نہیں ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ جو فصیل حائل کر دی جائے گی وہ ابدی نہیں ہے' بلکہ ان میں سے بھی جن کے اندر ایمان کی کچھ رمق ہوگی ان کو بہر حال وہاں سے نکلنا ہے۔ اس لئے یہاں پر صراحت کے ساتھ دروازے کا ذکر کیا گیا ہے' ورنہ واقعہ یہ ہے کہ اس کا کوئی اور محل نہیں ہے۔ جن لوگوں نے اس مقام پر زیادہ غور وفکر نہیں کیا وہ کہتے ہیں کہ اہل ایمان اُس دروازے کے ذریعے سے جنت میں داخل ہوں گے' حالانکہ اس مرحلے کی پوری تصویر جب سامنے آتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ فصل تو پہلے سے قائم ہو چکا ہوگا' کیونکہ جن کے پاس نور ہوگا وہ تو آگے نکل جائیں گے اور دوسرے انہیں پکارتے رہ جائیں گے کہ ذرا ٹھہرو' اور پھر ان کے مابین فصیل قائم کر دی جائے

© rasailojaraid

گی۔ فَضُرِبَ بَیْنَهُمْ میں ''ف'' تاکید کے لئے ہے۔ لہٰذا یہ دروازہ اہل جنت کے جنت میں داخلے کے لئے نہیں ہے' بلکہ درحقیقت یہ دروازہ اب آئندہ ان لوگوں کے لئے ہے جن کے دلوں میں ایمان کی کچھ نہ کچھ رمق اور روشنی ہو گی' لیکن وہ مجموعی طرزِ عمل کے اعتبار سے اِس سزا کے مستحق ہو چکے ہوں گے۔ لہٰذا وہ اپنے گناہوں کے بقدر سزا پا کر باہر نکل آئیں گے۔ یہ اہل سنت کا اجتماعی عقیدہ ہے۔

اب قرآن کریم میں کہیں اور اس کا تذکرہ کیوں نہیں ہے' اسے بھی سمجھ لینا چاہئے۔ دراصل بعض چیزیں عقلی اعتبار سے اتنی بلند ہوتی ہیں کہ عام لوگوں کے سامنے ان کو بیان کرنا اُن کے لئے فتنے کا سبب بن سکتا ہے' لہٰذا اعلیٰ ترین فلسفیانہ مسائل کو قرآن حکیم نے بہت ہی خفیہ اور فلسفیانہ انداز میں بیان کیا ہے کہ سمجھنے والا سمجھ جائے گا' عقلمند کے لئے اشارہ کافی ہوتا ہے' لیکن عام آدمی اس مقام پر سے یہ سمجھ کر گزر جائے گا کہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ اگر یہ بات بڑے اہتمام کے ساتھ آئی ہوتی تو عام آدمی بھی رک جاتا اور غور کرنے پر مجبور ہو جاتا' جبکہ اس کے اندر اس کی استعداد اور صلاحیت نہیں ہوتی۔ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے' جس میں سب کے لئے راہنمائی موجود ہے اور اس میں سب کی ضروریات کا احاطہ کیا گیا ہے' جبکہ دین کے بعض حقائق ایسے ہیں کہ ان کو زیادہ عام کر دیا جائے تو لوگوں میں بے عملی پیدا ہو جائے گی۔ ویسے تو یہ تصور کرنا بھی ہمارے لئے ممکن نہیں ہے کہ ایک لمحے کے لئے بھی جہنم کا داخلہ کس درجے شدائد اور مصائب کا ذریعہ بن جائے گا' لیکن اگر آدمی یہ سمجھ لے کہ ایمان کی کوئی رمق بھی ہوئی تو بالآخر جہنم سے نکل جائیں گے تو اس سے خواہ مخواہ اس کے اعصاب ڈھیلے پڑتے ہیں اور اس کے اندر عمل کا جذبہ کمزور پڑتا۔ لہٰذا یہ مضمون قرآن مجید میں شرح وبسط کے ساتھ نہیں آیا۔ اسی طرح سورۃ الفرقان میں ایک مقام ایسا آیا ہے کہ اس سے قرآن مجید میں عذابِ قبر کا ثبوت مل جاتا ہے' ورنہ قرآن مجید میں صراحت کے ساتھ عذابِ قبر کا تذکرہ نہیں ہے۔ وہاں فرمایا گیا ہے: ﴿یُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ﴾ ''دوگنا کیا جائے گا اس کے لئے عذاب قیامت کے دن''۔ معلوم ہوا کہ

© rasailojarai
© rasailojara
© rasailojara

قیامت سے پہلے بھی عذاب کی کوئی شکل ہے' جب ہی تو وہ دوگنا کیا جائے گا۔

مسلمان معاشرے میں منافق کا قانونی و دستوری سٹیٹس؟

اب ذرا چشم تصور سے دیکھئے کہ اہل ایمان آگے نکل گئے' منافقین اِدھر رہ گئے اور درمیان میں فصیل حائل ہو گئی۔ ﴿يُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ﴾ ''وہ انہیں پکار کر کہیں گے: کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟'' یہ اس امرِ واقعہ کی تعبیر ہے کہ دنیا میں منافق اور مؤمن' گناہگار اور متقی سب گڈمڈ ہیں' سب قانونی طور پر مسلمان ہیں' بلکہ مسلمان معاشرے میں منافق اور مؤمن کے اور متقی اور فاسق کے قانونی اور دستوری حقوق بالکل برابر ہیں۔ دنیا میں ان کے مابین معاشرتی' سیاسی اور دستوری حقوق میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس لئے کہ قانونی تقسیم تو بہر حال ایک ہی ہے' سب مسلمان شمار ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں امامِ اعظم امام ابوحنیفہؒ کا موقف ہے کہ: اَلْاِیْمَانُ قَوْلٌ لَا یَزِیْدُ وَلَا یَنْقُصُ یعنی ایمان تو زبانی اقرار کا نام ہے' جو نہ گھٹتا ہے نہ بڑھتا ہے۔ ان کی مراد حقیقی ایمان نہیں بلکہ قانونی ایمان ہے' جو انسان کو ایک قانونی و دستوری status دیتا ہے' اور وہ گھٹتا یا بڑھتا نہیں ہے' بلکہ جامد ہے۔ جبکہ حقیقی ایمان کا فیصلہ اللہ کے حضور جا کر ہو گا اور اس کا نور میدانِ حشر میں ظاہر ہو گا۔ کوئی متقی ہے تو اللہ کے ہاں اجر لے گا' فاسق ہے تو وہاں سزا بھگتے گا۔ یہاں تو مسلمان کی حیثیت سے سب برابر ہیں۔ جیسے کہا جاتا ہے ''اَلْمُسْلِمُ کُفْوٌ لِکُلِّ مُسْلِمٍ '' یعنی تمام مسلمان آپس میں مرتبہ اور سٹیٹس کے اعتبار سے بالکل ہم پلہ ہیں' قانونی اور دستوری حیثیت سب کی برابر ہے۔

میدانِ حشر میں جب چھلنی لگے گی اور حقیقی مؤمن اور محض نام کے مسلمانوں کے مابین تفریق ہو جائے گی تو یہ لوگ حقیقی اہل ایمان کو پکار پکار کر کہیں گے کہ کیا دنیا میں ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟ آج تمہارے اور ہمارے مابین اتنا فرق و تفاوت کیوں ہے؟ کیا ہم بھی مسجد نبویؐ میں تمہارے ساتھ نمازیں ادا نہیں کرتے تھے؟ ظاہر ہے کہ یہ لوگ اہل ایمان میں گڈمڈ تھے۔ یہ تو جب اُحد کا موقع آیا تو معلوم ہوا کہ کون کیا ہے' جب رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی تین سو آدمیوں کو لے کر میدان جنگ سے واپس آ گیا۔

© rasailojaraid

معلوم ہوا کہ جب تک آزمائش نہ ہو دنیا میں اصل اہل ایمان اور جھوٹ موٹ کے مسلمان کے مابین تمیز نہیں ہوسکتی۔ ورنہ تو دنیا میں وہ برابر تھے۔ یہاں تک کہ حضور ﷺ نے عبداللہ بن اُبی کی نماز جنازہ ادا کی ہے اور اس کی تدفین کے لئے اپنا کرتہ عنایت کیا ہے۔ اس لئے کہ اس کے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عبداللہ بن اُبی مؤمن صادق تھے' انہوں نے آکر درخواست کی کہ حضور! میرے باپ کا انتقال ہوگیا ہے' آپ اپنا کرتہ عنایت فرمادیں تو میں اسے اس کا کفن دے دوں۔ حضور ﷺ نے کرتہ عنایت فرمادیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ حضورؐ! آپ اس منافق کے لئے کرتہ دے رہے ہیں! آپؐ نے فرمایا: ''عمر! میرا کرتہ اسے خدا کے عذاب سے بچا نہیں سکے گا''۔ رسول اللہ ﷺ کی مروّت اور شرافت سے بعید تھا کہ آپؐ ایک مؤمن صادق کی درخواست ردّ کردیتے۔ گویا مرنے کے بعد بھی قبر میں اترنے تک اسے ''مسلم'' کا لیگل سٹیٹس حاصل رہا۔

© rasailojaraid

راہِ ''نفاق'' کے سنگ ہائے میل اور فتنے کی تین نسبتیں

منافقین کی پکار کے جواب میں اہل ایمان کا جواب نقل ہوا: ﴿قَالُوْا بَلٰی﴾ ''(اہل ایمان) کہیں گے: کیوں نہیں!'' اب آگے جو الفاظ آرہے ہیں وہ علم و معرفت اور تفقہ کا بہت بڑا خزانہ ہیں۔ فرمایا: ﴿وَلٰـكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ﴾ ''لیکن تم نے اپنے آپ کو (اپنے ہاتھوں) فتنے میں ڈالا''۔ اب اہل ایمان جواب دے رہے ہیں کہ دنیا میں تو تم ہمارے ساتھ ہی تھے' اس میں کوئی شک نہیں' لیکن تم نے اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں فتنے میں ڈالا۔

فتنے کی تین نسبتیں ہیں جنہیں اچھی طرح نوٹ کر لینا چاہئے۔ کہیں تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہم نے تمہیں فتنے میں ڈالا۔ مثلاً: ﴿وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ (العنکبوت: ۳) ''اور ہم نے فتنے میں ڈالا ہے ان کو جو اِن سے پہلے تھے''۔ اللہ تعالیٰ اپنی طرف نسبت فرما رہا ہے کہ جو اِن سے پہلے تھے انہیں بھی ہم نے فتنے میں ڈالا تھا۔ یہ ہمارا قاعدہ رہا ہے کہ ہم آزما کر ظاہر کردیں کہ کون کھرا ہے' کون کھوٹا ہے' کون حقیقتاً

© rasailojaraid

مؤمن ہے اور کون جھوٹ موٹ کا مدعیٔ ایمان ہے۔ تو اصل امتحان اللہ کی طرف سے ہے۔ لیکن مکہ میں اہل ایمان کا یہ امتحان کن کے ہاتھوں آ رہا تھا؟ ابوجہل اور دیگر کفار کے ہاتھوں! تو گویا دوسری نسبت ان کفار کی طرف ہو گئی جو مسلمانوں کو ستا رہے تھے اور انہیں فتنے میں ڈال رہے تھے۔ جیسا کہ سورۃ البروج میں فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ فَتَنُوا الۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَ الۡمُؤۡمِنٰتِ ثُمَّ لَمۡ یَتُوۡبُوۡا فَلَهُمۡ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَ لَهُمۡ عَذَابُ الۡحَرِیۡقِ ﴿۱۰﴾﴾ (آیت ۱۰) ''وہ لوگ جنہوں نے اہل ایمان مَردوں اور عورتوں کو فتنوں میں مبتلا کیا اور پھر اس سے توبہ نہیں کی یقیناً ان کے لئے جہنم کا عذاب اور جلائے جانے کی سزا ہے''۔ جو لوگ اہل ایمان کو آزمائشوں میں ڈالتے ہیں' انہیں ستاتے اور تکالیف میں مبتلا کرتے ہیں' اگر مرنے سے پہلے پہلے انہوں نے توبہ کر لی اور ایمان لے آئے تب تو پچھلا کیا دھرا سارا معاف ہو جائے گا' ورنہ ان کے لئے عذابِ جہنم ہے۔

تیسری نسبت یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو خود فتنے میں ڈالتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جو لوگ اہل وعیال اور مال و متاعِ دُنیوی کی محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور ان کی محبت کو اللہ کی محبت پر ترجیح دیتے ہیں وہ اپنے آپ کو فتنے میں مبتلا کر لیتے ہیں۔ سورۃ التغابن میں ارشادِ الٰہی ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّ مِنۡ اَزۡوَاجِکُمۡ وَ اَوۡلَادِکُمۡ عَدُوًّا لَّکُمۡ فَاحۡذَرُوۡهُمۡ ۚ﴾ (آیت ۱۴) ''اے ایمان والو! تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں' ان سے ہوشیار رہو''۔ مزید فرمایا: ﴿اِنَّمَاۤ اَمۡوَالُکُمۡ وَ اَوۡلَادُکُمۡ فِتۡنَةٌ ؕ﴾ (آیت ۱۵) ''یقیناً تمہارے مال اور تمہاری اولاد (تمہارے لئے) فتنہ ہے''۔ یعنی اگر تم اپنے اہل وعیال سے اللہ کی محبت کے ماتحت رہتے ہوئے محبت کرو تو ٹھیک ہے' یہ بھی فطری محبتیں ہیں اور دُنیوی ضرورت ہے' لیکن جہاں ان میں سے کسی ایک کی محبت بھی اللہ کی محبت سے بالا ہو گئی تو گویا تم نے اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں فتنے میں مبتلا کر دیا۔ یہ انسان کے اپنے عمل پر منحصر ہے۔ تو حقیقی اہل ایمان منافقین کو جواب دیں گے: ﴿وَ لٰکِنَّکُمۡ فَتَنۡتُمۡ اَنۡفُسَکُمۡ﴾ ''لیکن تم نے اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں فتنے میں ڈالا''۔ ﴿وَ تَرَبَّصۡتُمۡ﴾ ''اور پھر تم گومگو کی

© rasailojaraid
© rasailojaraid
© rasailojaraid

کیفیت میں مبتلا ہو گئے''۔

تَـرَبُّـص کے معنی ''انتظار'' کے بھی ہیں کہ آدمی کسی جگہ پر ٹھٹک کر کھڑا ہو جائے۔ کوئی تو ایسا ہوتا ہے کہ جس کی ہر چہ بادا باد والی کیفیت ہوتی ہے' جبکہ کوئی ایسا ہوتا ہے کہ کسی وجہ سے ٹھٹک کر کھڑا ہو جاتا ہے کہ چلوں نہ چلوں؟ آگے بڑھوں نہ بڑھوں؟ یہ اصل میں تَـرَبُّـص ہے۔ یہ لوگ ''تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو!'' کے مصداق حالات کا انتظار کرتے ہیں کہ حالات میں کیا تبدیلی آتی ہے۔ تمام صورتوں کو دیکھ بھال کر' دائیں بائیں اور آگے پیچھے دیکھتے ہوئے' اچھی طرح سوچ سمجھ کر' سنبھل کر اور بچ بچ کر چلتے ہیں۔ جیسے کہا گیا ہے: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ج﴾ (الحج:۱۱) ''لوگوں میں سے کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جو اللہ کی بندگی کرتا ہے کنارے کنارے''۔ یہ لوگ منجدھار میں نہیں کودنا چاہتے۔ ﴿فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ﹰاطْمَاَنَّ بِهٖ ج وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ﹰانْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ج خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ط﴾ ''پھر اگر اسے کوئی خیر پہنچے تو اس سے مطمئن ہو جاتا ہے اور اگر اسے کوئی آزمائش (تکلیف) پہنچے تو اپنے چہرے کے بل واپس پلٹتا ہے۔ اس نے دنیا اور آخرت (دونوں) کا خسارہ اٹھایا''۔ یعنی یہ لوگ بچ بچ کر اور کنارے کنارے چلنا چاہتے ہیں' منجدھار میں نہیں جانا چاہتے۔ اگر بس خیر رہے تو مطمئن ہیں اور اگر کہیں کوئی امتحان آ گیا' آزمائش آ گئی تو اوندھے منہ گر پڑتے ہیں۔ ان کے اس طرزِ عمل کے بارے میں فرمایا گیا کہ یہ دنیا اور آخرت دونوں کے خسارے کا سودا ہے۔ تو یہاں فرمایا گیا کہ جب تم نے اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں فتنے میں ڈالا اور مال و اولاد' اہل و عیال' علائق دُنیوی' جائیداد' پروفیشنز' ان تمام چیزوں کی محبت تم پر غالب آ گئی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تم تَـرَبُّـص اور گومگو کی کیفیت میں مبتلا ہو گئے کہ آگے بڑھیں یا نہ بڑھیں! کہیں ایسا نہ ہو جائے' کہیں ویسا نہ ہو جائے! یہ حقیقت ہے کہ انسان کے اندر نیکی کا جذبہ بھی موجود ہے' لیکن وہ تذبذب کا شکار ہو جاتا ہے۔ بقول غالب ؎

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے!

منافقین کی اس کیفیت کے لئے سورۃ النساء میں الفاظ آئے ہیں: ﴿مُـذَبْـذَبِـيْـنَ بَيْـنَ

© rasailojaraid

ذٰلِکَ﴾ کہ یہ مذبذب ہو کر رہ گئے ہیں۔ اور سورۃ التوبۃ میں فرمایا: ﴿فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ ﴾ ''وہ اپنے شکوک و شبہات میں متردّد ہو کر رہ گئے''۔ یہاں آگے فرمایا: ﴿وَارْتَبْتُمْ ﴾ ''اور تم شکوک و شبہات میں مبتلا ہو گئے''۔ یعنی اپنے آپ کو فتنے میں ڈالنے کا تیسرا نتیجہ یہ ہے کہ ایمان کی جو پونجی تمہیں نصیب ہوئی تھی اس میں شکوک و شبہات کے کانٹے چبھنے شروع ہو گئے کہ ہم اپنا سب کچھ یہاں کھپا دیں اور معلوم نہیں کہ اس کا کچھ بدلہ بھی ملے گا یا نہیں! پتہ نہیں آخرت ہو گی بھی یا نہیں۔ یقین تو نہیں ہے' کسی نے دیکھا تو نہیں۔ اس لئے کہ یہ سارا ادھار کا سودا ہے۔ جیسے سورۃ التوبۃ میں فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ﴾ ''اہل ایمان سے اللہ نے ان کے مال اور جانیں خرید لئے ہیں جنت کے عوض''۔ جنت تو ملے گی آخرت میں' یہاں تو نہیں ملے گی۔ یہ تو ادھار کا سودا ہے اور ادھار کے سودے پر آدمی کچھ نہ کچھ تو متردّد ہوتا ہے۔ اگر نقد سودا ہو تو ٹھیک ہے کہ ہاتھ سے ایک چیز دی اور دوسری لے لی' مبادلہ فوراً ہو گیا' لیکن یہ تو ادھار کا سودا ہے۔ تو اس تَرَبُّص کے نتیجے میں ایمان کی پونجی برف کی طرح پگھلنا شروع ہو گئی۔

اپنے آپ کو فتنے میں ڈالنے کے سبب جو تَرَبُّص پیدا ہوتا ہے اس حوالے سے سورۃ التوبۃ کی آیت ۲۴ بڑی اہم ہے۔ فرمایا:

﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴾

''(اے نبی ﷺ!) ان سے کہہ دیجئے کہ اگر تمہیں اپنے باپ' اپنے بیٹے' اپنے بھائی' اپنی بیویاں' اپنے رشتہ دار اور وہ مال جو تم نے بڑی محنت سے کمائے (اور جمع کئے) ہیں' اور وہ کاروبار جن کے کساد (اور مندے) کا تمہیں اندیشہ رہتا ہے (جو بڑی مشقت سے تم نے جمائے ہیں) اور وہ رہائش گاہیں (جائیدادیں' بلڈنگیں' حویلیاں اور کوٹھیاں) جو تمہیں بڑی پسند ہیں' (یہ آٹھ چیزیں) اگر محبوب تر ہیں (تمہیں چیزوں سے) اللہ سے' اللہ کے رسول سے اور اللہ کی راہ

© rasailojara
© rasailojara

میں جہاد کرنے سے‘ تو جاؤ انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا فیصلہ (عذاب) لے آئے‘ اور اللہ ایسے فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا‘‘۔

یہ گویا ایک ترازو ہے جسے ہر شخص اپنے باطن میں نصب کر لے۔ ایک پلڑے میں آٹھ چیزیں ڈالیں جن میں سے پانچ علائق دُنیوی ہیں‘ یعنی باپ‘ بیٹا‘ بھائی‘ بیوی اور رشتہ دار —— باقی ہر انسان تو اس کے بعد ہی آتا ہے —— اور تین چیزیں دُنیوی مال و اسباب میں سے ہیں‘ نقد مال و دولت‘ کاروبار اور اثاثہ جات یعنی بلڈنگ یا جائیداد وغیرہ۔ اور ترازو کے دوسرے پلڑے میں تین کی محبت ڈالیں‘ یعنی اللہ کی محبت‘ رسولؐ کی محبت اور اللہ کی راہ میں جہاد کی محبت۔ پھر دیکھیں کہ کون سا پلڑا بھاری ہے! اگر یہ آٹھ والا پلڑا بھاری ہے تو اس صورت میں ’’فَتَرَبَّصُوْا‘‘ جاؤ‘ انتظار کرو! یہ وہی لفظ تَرَبُّص ہے جو زیر درس آیت میں ہے۔ اب تَرَبُّص اور گومگو کی کیفیت تو لازماً ہوگی کہ چلوں نہ چلوں۔ اس آیت میں مذکور علائقِ دُنیوی کو اقبال نے ایک شعر میں جمع کیا ہے ؎

یہ مال و دولتِ دنیا یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں‘ لا الٰہ الا اللہ!

جان لیجئے کہ یہ تَرَبُّص اور اِرتیاب ایک دن میں نہیں ہو جاتا‘ بلکہ یہ رفتہ رفتہ اور تدریجاً پسپائی کا نتیجہ ہوتا ہے اور اس کے بعد ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ آدمی ایمان سے بالکل خالی ہو جاتا ہے۔ جیسے سورۃ المنافقون میں فرمایا گیا: ﴿ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا﴾ ’’یہ اس لئے ہوا کہ وہ پہلے ایمان لے آئے‘ پھر کفر میں چلے گئے‘‘۔ یا یہ کہ ایمان اتنا کمزور رہ جاتا ہے کہ وہ عمل پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ اس صورت میں پھر عمل میں تناقض اور تضاد ہوتا ہے۔ آدمی کہتا کچھ ہے اور کرتا کچھ ہے۔ جیسے سورۃ الصّف کی آیت ۲ میں فرمایا گیا ہے: ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝﴾ ’’اے اہل ایمان! وہ کہتے کیوں ہو جو کرتے نہیں ہو‘‘۔ یعنی قول و فعل میں تضاد۔

خوشنما عقائد و خواہشات‘ شیطان کی پُرفریب چالیں

آگے فرمایا: ﴿وَغَرَّتْکُمُ الْاَمَانِیُّ﴾ ’’اور تمہیں آرزوؤں نے دھوکے میں

© rasailojaraid
© rasailojaraid
© rasailojaraid

ڈالے رکھا''۔ یہ چوتھا مرحلہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو کچھ من گھڑت اور خوشنما عقائد سے بہلاتا ہے۔ اَمَانِیُّ لفظ اُمْنِیَّۃٌ کی جمع ہے اور اسی مادے سے لفظ ''تمنا'' بنا ہے' یعنی خواہشات' آرزوئیں۔ انگریزی میں انہیں ''wishful thinkings'' کہتے ہیں۔ اس کی مثالیں یہود کے عقائد میں موجود ہیں۔ وہ کہا کرتے تھے: ﴿سَیُغْفَرُ لَنَا﴾ ''عنقریب ہمیں معاف کر دیا جائے گا''۔ اللہ ہمیں بخش دے گا' وہ بخشنہار ہے' ہمیں تو بخش ہی دیا جائے گا۔ ہم میں سے بھی ایک گروہ ہے جو کہتا ہے آخر کچھ بھی ہیں کلمہ گو ہیں' کچھ بھی ہیں محمد ﷺ کے نام لیوا تو ہیں۔ وہ یہ بھی کہا کرتے تھے: ﴿لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ﴾ ''ہمیں آگ ہرگز نہیں چھوئے گی مگر گنتی کے چند دن'' اور ﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰہِ وَاَحِبَّآؤُہٗ﴾ ''ہم تو (گویا) اللہ کے بیٹے اور اس کے بڑے چہیتے ہیں''۔ آخر ہم ابراہیمؑ کی نسل سے ہیں' تو کیا اللہ تعالیٰ ابراہیمؑ کا کچھ بھی لحاظ نہیں کرے گا؟ جس کو کہ اللہ نے اپنا دوست کہا ہے۔ قرآن مجید کے الفاظ ہیں: ﴿وَاتَّخَذَ اللّٰہُ اِبْرٰھِیْمَ خَلِیْلًا ۝﴾ ''اور اللہ نے ابراہیم کو دوست بنا لیا''۔ تو کیا اللہ اپنے دوست کی اولاد کی کوئی فکر نہیں کرے گا؟ ہمارے ساتھ عام لوگوں والا معاملہ نہیں ہوگا' بلکہ خاص معاملہ ہو گا۔ تو یہ سب ان کی اَمَانِی ہیں۔ قرآن جہاں کہیں ان کے عقائد نقل کرتا ہے تو ساتھ ہی فرماتا ہے: ﴿تِلْکَ اَمَانِیُّھُمْ﴾ کہ یہ ان کی wishful thinkings ہیں' یہ ان کے من گھڑت خیالات ہیں۔ ﴿قُلْ ھَاتُوْا بُرْھَانَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝﴾ ''(اے نبی! ان سے) کہیے کہ لاؤ دلیل اگر تم (اپنے دعوے میں) سچے ہو''۔ کہیں تورات میں اللہ نے یہ گارنٹی تمہیں دی ہے؟ تو یہ انسان کی اَمانی اور من گھڑت عقائد اسے طفل تسلیاں دیتے ہیں۔

آخری بات یہ فرمائی: ﴿حَتّٰی جَآءَ اَمْرُ اللّٰہِ﴾ ''یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ آ گیا''۔ یہ وہی الفاظ آ گئے ہیں جو سورۃ التوبہ کی آیت ۲۴ میں ہیں: ﴿فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰہُ بِاَمْرِہٖ﴾ ''جاؤ' انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ لے آئے''۔ یعنی یہ جو حق و باطل کی کشمکش ہو رہی ہے اس کے ضمن میں اللہ کا فیصلہ آ جائے۔ دوسرے یہ کہ اللہ کا

© rasailojaraid.com

فیصلہ موت بھی ہے، اللہ کا فیصلہ قیامت بھی ہے۔ آگے فرمایا: ﴿وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۝﴾ ''اور وہ بڑا دھوکے باز (شیطان) تمہیں اللہ کے معاملے میں دھوکہ دیتا رہا''۔ یہاں نوٹ کیجئے کہ یہ لفظ 'غَـرور'' 'غ' کے زبر (َ) کے ساتھ ہے اور یہ فَعُول کے وزن پر مبالغے کا صیغہ ہے، جس کا مطلب ہے بہت بڑا دھوکے باز۔ اس کے علاوہ ایک لفظ 'غُـرور' ہے جو 'غ' کے پیش (ُ) کے ساتھ ہوتا ہے۔ ہم اردو میں بھی غُرور کا لفظ استعمال کرتے ہیں کہ اسے بڑا غرور ہے۔ اور مغرور اس سے اسم الفاعل ہے۔ تو فرمایا جا رہا ہے کہ ''تمہیں خوب دھوکہ دیا اس بہت بڑے دھوکے باز نے''۔ اس سے شیطان لعین مراد ہے۔ یہ شیطان لعین بھی انسان کو مزید لوریاں دے دے کر سلاتا ہے۔ اور اس کی لوری یہ ہے کہ اللہ بڑا غفور ہے، وہ کہاں سزا دے گا! وہ تو لوگوں کو ایسے ہی ڈرانے کے لئے کہتا ہے تاکہ وہ سیدھے ہو جائیں۔ ورنہ کیا ماں اپنی اولاد کو اپنے ہاتھوں جہنم میں ڈال سکتی ہے؟ تو جو خالق و مالک ہے وہ یہ کیسے کرسکتا ہے! یہ تو صرف کہنے کی باتیں ہیں، ہونے والی باتیں نہیں ہیں! یہ عقائد ہمارے ہاں بھی ملنگ قسم کے صوفیوں میں موجود ہیں۔ وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ جہنم کا صرف ڈراوا ہی ہے، وگرنہ ایسا نہیں ہوگا۔ اللہ تو بڑا کریم ہے، بڑا نکتہ نواز اور بندہ نواز ہے، وہ بڑا ہی غفور اور رحیم ہے، لہٰذا اس کے بارے میں یہ گمان نہ کرو کہ وہ تمہیں عذاب دے گا۔ سورۃ الانفطار پوری کی پوری ان کے اسی عقیدے کی تردید میں ہے۔ فرمایا: ﴿یٰۤاَیُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِیْمِ ۝﴾ ''اے انسان! کس شے نے تجھے دھوکہ دیا ہے اپنے ربّ کریم کے بارے میں؟'' وہ کریم بھی ہے، اس میں کوئی شک نہیں، لیکن وہ عزیزٌ ذوانتقام (انتقام لینے میں سخت) بھی ہے۔ وہ قہار بھی ہے، وہ شدیدُ العِقَاب (سخت سزا دینے والا) بھی ہے۔ اس کی تو تمام شانیں ہیں اور ان تمام شانوں کو اپنے سامنے متحضر رکھنا ضروری ہے۔

بارک اللہ لی ولکم فی القرآن العظیم ونفعنی وایاکم بالآیات والذکر الحکیم

(ترتیب وتسوید: طارق اسماعیل ملک)

© rasailojaraid.